© rasailojaraid.com

قسط:۸

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

سکول کی عمارت:

پرائمری تک تو میں نے اپنی تعلیم شہر میں ہی اسلامیہ ہائی سکول میں حاصل کی۔ پانچویں جماعت میں ہم اسلامیہ ہائی سکول کی نئی عمارت میں چلے گئے جو لائل پور (فیصل آباد) جانے والی سڑک کے کنارے تعمیر کی گئی تھی۔ پانچویں جماعت سے دسویں جماعت تک کی تمام کلاسیں یہاں منتقل ہوگئیں۔ یہ نئی عمارت ۱۹۴۴ء۔۱۹۴۵ء تک مکمل ہوگئی تھی۔ انتہائی خوبصورت، دلکش اور دیدہ زیب عمارت کہ جس میں داخل ہوتے ہی کشادگی کا احساس دل و دماغ کو فرحت و شادانی کا سامان مہیا کرتا اور عمارت سے اسلامی فنِ تعمیر کا عکس نظر آتا تھا۔ ماحول کو اسلامی بنانے کے لیے دیواروں پر لکھے اشعار خوبصورت کردار ادا کر رہے تھے۔ بعض اشعار مجھے آج تک یاد ہیں۔

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا　　پھر انجام اُس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں　　اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں　　کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

آج یہ عمارت گورنمنٹ اسلامیہ کالج میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ہائی سکول سے انٹر کالج، انٹر سے ڈگری کالج اور پھر ایم۔اے کلاسوں کے اجراء نے اسے چنیوٹ کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ بنا دیا ہے۔ عمارت کی دائیں جانب ایک بڑا وسیع گراؤنڈ ہے جہاں بڑے بڑے جلسوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ قومی درجے کے لیڈر عموماً اسی گراؤنڈ میں اہلیانِ شہر سے مخاطب ہوتے ہیں۔

زندگی میں پہلی تقریر:

ابھی اس نئی عمارت میں منتقل ہوئے کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ سکول میں ایک تقریب کے موقع پر مجھے اپنی زندگی کی پہلی تقریر کرنے کا موقع ملا۔ انجمن اسلامیہ چنیوٹ کی نگرانی میں یہ سکول تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ اسی انجمن کے کسی اہم فرد کی سکول آمد پر یہ تقریب منعقد کی گئی۔ مجھے اپنی کلاس میں سے تقریر کے لیے چنا گیا۔ ٹیچر انچارج نے کہا کہ کسی سے تقریر لکھوا لو اور اسے خوب اچھی طرح یاد کر لو۔ میں نے اپنے چچا جاوید منیر احمد سے کہا تو وہ مجھے قاضی جعفر قاسمی کے پاس ان کے گھر لے گئے۔ جو شہر کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ''شہرِ لبِ دریا'' میں ان پر ایک الگ باب رقم کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ اسی سکول میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور بطور شاعر شہر بھر میں ان کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ قاضی جعفر قاسمی نے مجھے ایک مختصر تقریر لکھ دی۔ جو میں نے بڑی محنت سے یاد کر لی۔ انہوں نے دو چار مرتبہ مجھ سے میری تقریر سنی اور کچھ ہدایات بھی دیں کہ تقریر کرتے ہوئے گھبرانا نہیں، ضرورت سے زیادہ کہیں رُکنا بھی نہیں۔ کس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جگہ بلند آواز سے بولنا اور کس جگہ قدرے کم آواز سے۔ ہاتھوں کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ کس فقرے پر اپنے ہاتھ کو بلند کرنا ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر یہ بھی کہا کہ تقریر ایسا عمل ہے کہ جس میں جوش، جذبے اور ولولے کی بھی اشد ضرورت ہوگی، اس کا اظہار بھی دورانِ تقریر ضروری ہے۔ لوگوں کو یہ احساس ہو کہ تم تقریر کر رہے ہو نہ کہ کتاب پڑھ رہے ہو، جو کچھ تم نے تقریر میں کہنا ہے اس طرح کہنا کہ یہ تمہارے دل کی آواز ہے۔ تلفظ اور لہجے کا بھی خاص خیال رکھنا ہے۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ہو تو تقریر کا تأثر بھی غلط ہو جاتا ہے۔ ایسی بہت سی ہدایات تھیں جو میرے پیشِ نظر تھیں۔ تقریر تو اس وقت پوری یاد نہیں تاہم ابتدائی چند فقرے یاد ہیں، جن سے تقریر کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تقریر کا ابتدائیہ کچھ اس طرح تھا۔

''اے اسلام کی حُریت پہ کٹ مرنے والے مجاہد! تیرے نام سے اسلام کا نام زندہ اور باقی ہے۔ تو نے ہاں ہاں! تُو نے ہی تو میدانِ جہاد میں اسلام کے نام کو تابندہ اور اسلام کے علم کو سر بلند رکھا۔ اور غیرت ملی سے دین دشمن قوتوں کی صفوں میں ہلچل مچائے رکھی تُو نے ہی قیصر و کسریٰ کے کرّ وفر، شان و شوکت کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر پر رکھا اسی لیے جب تجھے شہادت کا مژدہ سنایا جاتا ہے تو تیرے نورانی چہرے پر مسرّت و انبساط کی کرنیں رقص کرنے لگتی ہیں۔''

جب تقریر کرنے کا وقت آیا تو سارے سکول کے طالب علم موجود تھے۔ سکول کی عمارت کے آگے کھلے صحن میں سکول کا سارا عملہ کرسیوں پہ بیٹھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر طفیل محمد صاحب اور مہمانان گرامی ان کرسیوں کے درمیان خصوصی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ تلاوت و نعت کے بعد جب میں تقریر کے لیے اٹھا تو مجھے کسی قسم کی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ بڑی محنت کے ساتھ تقریر تیار کی تھی۔ تقریر کرتے ہوئے مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی ہاتھ میں اسلام کی تلوار ہے جس سے میں دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد میں مصروف ہوں۔ جوش اور ولولہ نے تقریر سے بڑھ کر خود مقرر کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ہر طرف تالیوں کی گونج سے تقریر کا تأثر واضح ہوتا تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو مجھے مہمانِ خصوصی کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے مجھے شاباش دی اور بطور انعام چاندی کا ایک روپیہ بھی دیا۔ ہیڈ ماسٹر طفیل محمد صاحب نے تو مجھے فرطِ مسرّت میں اوپر اٹھا لیا۔ میرا منہ، سر چوما اور نہایت حوصلہ افزائی کی۔

یہ تقریر میرے اعتماد اور میری قوتِ گفتار اور میرے جذبات کے اظہار کا پہلا مرحلہ تھا جسے میں نے بہرحال سر کر لیا۔ اس تقریر کی کامیابی کا سہرا جماعت احرار کے اس تربیتی ماحول کے سر تھا جس میں رہتے ہوئے میرے اندر اعتماد پیدا ہوا اور اسٹیج کے خوف میں گرفتار نہیں ہوا۔

سکول کے اساتذہ:

سکول کے تمام اساتذہ انتہائی محنتی اور تجربہ کار تھے۔ ہیڈ ماسٹر طفیل محمد صاحب تو سکول کی زینت تھے۔ نظم و ضبط ان کی پہلی ترجیح تھی۔ تمام اساتذہ فطری طور پر بنے تھے اور مشنری جذبے کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ آج کل کی طرح ''بائی چانس'' یا مجبوراً استاد نہیں تھے سیکنڈ ہیڈ ماسٹر جناب سلطان محمد تھے۔ ماسٹر اقبال صاحب یہاں سے کوئٹہ چلے گئے تھے۔ جب میں 1952ء میں کوئٹہ گورنمنٹ کالج کے ساتھ ہاکی کا میچ کھیلنے کے لیے وہاں گیا تو مجھے اتفاقاً مل گئے۔ مدتوں بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے شفیق استاد کی غیر متوقع زیارت نے مجھے ایک عجیب کیفیت میں مبتلا کر دیا اور میں گزرے لمحوں کی یاد میں کافی دیر تک کھویا رہا۔ اسی طرح ماسٹر خیال مراد آبادی اردو کے فاضل اور مستند استاد تھے۔ مرزا محمد اسحٰق، ماسٹر شیخ محمد صادق، ماسٹر عطا محمد سہارن صاحب..... سکول کا نقشہ بھی جن کی ذہنی کاوش کا ہی نتیجہ تھا...... ڈرائنگ ماسٹر تھے۔ ماسٹر محمد بشیر صاحب میرے چچا (والدِ محترم کے ماموں زاد بھائی) تھے جو انگریزی اور حساب میں شہر بھر میں خصوصی مہارت کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ خود میرے والدِ محترم نذیر مجیدی بھی اس وقت انگلش گرائمر پڑھاتے تھے لیکن جلد ہی یہاں سے مستعفی ہو کر کاکول اکیڈمی چلے گئے۔

بچپن کی ایک شرمساری:

اسی سکول میں مَیں نے زندگی میں ایک چوری کی جو مجھے رہتی عمر تک یاد رہے گی اور اس سلسلے میں مجھے جو شرمندگی اٹھانا پڑی اس کا مجھے آج بھی شدت کے ساتھ احساس ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ شرمندگی فی نفسہٖ ایک ایسی سزا ہے جو مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اس چوری کے حوالے سے میرے اس جماعت کے انچارج ٹیچر جو غالباً ملتان سے متعلق تھے ان کی انسانی نفسیات پر گہری نگاہ مجھے آج بھی جب میں یہ واقعہ تحریر کر رہا ہوں حیران و ششدر کر رہی ہے، ہوا یوں کہ ان کی کلاس میں میرے پاس بیٹھے ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر کہا کہ ''سر میرے بستے سے کسی نے میری کہانی والا ایک کتابچہ نکال لیا ہے۔ اس شکایت پر استادِ محترم نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا کیونکہ میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ میرا جواب تھا کہ:

> ''میرے پاس ایسے کئی کہانی والے کتابچے پہلے ہی موجود ہیں، جو میں اپنے والد صاحب سے اصرار کر کے منگواتا ہوں۔ مجھے کہانیاں یاد کر کے دوسروں کو سنانے کا بہت شوق ہے۔ لہٰذا میرے پاس پہلے ہی جب ایسے کتابچے بڑی تعداد میں موجود ہیں تو مجھے اس کے بستے سے اس کے کتابچے نکالنے کی کیا ضرورت ہے''

میری اس تقریر سننے کے بعد استادِ محترم نے فوراً مجھے کہا ''شبیر! اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے بستے سے اس کا کہانی والا کتابچہ نکال کر اسے واپس کر دو''۔ میں ششدر رہ گیا اور میں نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ وہ کتابچہ اسے واپس کر دیا جو میں نے ہی اس کے بستے سے نکالا تھا۔

دہلی میں قیام ۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶ء:

والد صاحب تو چنیوٹ سے کاکول چلے گئے۔ ہم یہاں پر ان کے بغیر ہی رہ رہے تھے۔ کاکول میں خط کتابت کے ذریعے ان سے رابطہ تھا۔ لیکن اچانک ان کے ایک خط کے ذریعے پتہ چلا کہ وہ کاکول کی نوکری بھی چھوڑ کر دہلی گئے ہیں۔ وہاں انہوں نے کوئی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد ان کا ایک اور خط موصول ہوا کہ انہوں نے دہلی میں ہماری رہائش کے لیے بھی جگہ لے لی ہے اور لکھا کہ تم لاہور آ کر دہلی جانے والی گاڑی سے دہلی آ جاؤ۔ دن اور تاریخ سے مطلع کرو اور وہ ہمیں دہلی ریلوے اسٹیشن سے لے لیں گے۔ چنانچہ ہم انتہائی خوشی کے ساتھ دہلی کے لیے تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ جب ہم نے تیاری مکمل کر لی تو والد صاحب کو چلنے سے چند روز پہلے بذریعہ خط دہلی پہنچنے کے دن اور تاریخ سے مطلع بھی کر دیا جس روز ہم نے چنیوٹ سے لاہور کے لیے اپنے ماموں زاد بھائی محمد بشیر راجھہ مرحوم کے ساتھ جو محکمہ ڈاک میں ملازم تھے، روانہ ہونا تھا، والد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب سے ملاقات کے شوق میں اس سے ایک روز پہلے ہی روانہ ہو گئے۔ یہ خیال لاہور پہنچ کر ہوا کہ ہم تو دہلی اس دن سے ایک دن پہلے جو ہم نے والد محترم کو لکھ رکھا ہے' پہنچ جائیں گے تو ہم نے لاہور سے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے انہیں اطلاع دے دی کہ ہم مقررہ دن سے ایک دن پہلے دہلی پہنچ رہے ہیں اس لیے آپ ایک دن پہلے ہمیں ریلوے سٹیشن سے لے لیں۔

لاہور ریلوے سٹیشن سے گاڑی رائے ونڈ کے لیے روانہ ہوئی، رات کا وقت تھا، پھر رائے ونڈ سے گاڑی جالندھر، رہتک، حصار، کرنال، گڑگاؤں، پانی پت اور سہارن پور والی لائن پر روانہ ہوئی۔ سفر انتہائی سکون کے ساتھ طے ہوا گاڑی ہر سٹیشن پر اپنے وقت پر رکتی اور چلتی رہی۔ مسافروں میں سے کسی کو کسی قسم کی کسی دوسرے مسافر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ غالباً صبح دس گیارہ بجے کے قریب گاڑی دہلی ریلوے سٹیشن پر رکی اپنے ڈبے سے باہر آئے، مختصر سامان کے ساتھ ہمارا چھوٹا سا قافلہ جس میں والدہ محترمہ اور مجھ سے چھوٹے تین بھائی صغیر احمد، نصیر احمد اور ظہیر احمد جو والدہ کی گود میں تھا جب دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو میرے ذہن میں پہلی جماعت کے اردو قاعدہ کی ایک عبارت نہ جانے کیوں بار بار مجھے دہلی کے بڑے شہر ہونے سے ڈرانے لگی' عبارت تھی ''دہلی بڑا شہر ہے، تم اس نکڑ پر ٹھہرو، میں ٹوکری میں بھٹے لاتا ہوں، آج مسور کی دال پکالو۔''

دہلی ریلوے سٹیشن پر پریشانی:

دہلی کے بڑے شہر ہونے کا رعب تو تھا ہی لیکن میں اس کیفیت کے باوجود پُرعزم بھی تھا کہ اگر شہر بڑا ہے تو کیا، میں بھی اب بڑا ہو چکا ہوں۔ ہم پلیٹ فارم پر اپنے مختصر سامان کے ساتھ تھے لیکن والد صاحب کہیں نظر نہ آئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہماری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ قلی بار بار ہمارے پاس آ کر کہتے کہ سامان اٹھائیں لیکن ہم انکار کرتے رہے کہ ہمیں کسی کا انتظار ہے جب آدھ پون گھنٹے کے بعد بھی والد صاحب نہ آئے تو میں نے اپنی والدہ صاحبہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ مجھے والد صاحب کا پتہ یاد ہے۔ اسی پتہ پر اللہ کا نام لے کر چلتے ہیں، جس پتہ پر ہم والد صاحب کو خط لکھتے تھے، وہ مجھے ازبر ہے ''نیولیڈر کو، بلی ماراں دہلی''۔ میں نے جی کڑا کر کے قلی سے کہا کہ سامان باہر لے چلو۔ ہم ریلوے سٹیشن سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئے اور ایک تانگے والے سے کہا کہ ہمیں بلی ماراں لے چلو۔ سامان تانگے پر رکھ لیا اور یہ پریشان قافلہ اپنی منزل کی تلاش میں چل نکلا۔ سٹیشن سے باہر ہمارے بائیں ہاتھ گاندھی گارڈن تھا۔ ذرا آگے گئے تو دائیں ہاتھ پر دہلی کارپوریشن کی عمارت تھی جس کے بعد ہم دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں آ گئے۔ چاندنی چوک میں داخل ہو کر ہم اپنے دائیں ہاتھ مڑ گئے ساتھ ہی گھنٹہ گھر کی عمارت تھی جسے کراس کر کے آگے بڑھے تو تانگہ بائیں ہاتھ مڑ گیا۔ ٹانگے والے نے کہا کہ یہ بلی ماراں کا محلّہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اتوار کا دن تھا، بلی ماراں کی سڑک کے دونوں طرف دکانیں بند تھیں۔ میں نے تھوڑی دور چل کر تانگہ کھڑا کرنے کو کہا اور آتے جاتے لوگوں سے پوچھا کہ یہاں ''نیولیڈر کو'' کہاں ہے؟ کسی نے اس بارے میں کچھ نہ بتایا تو میں نے تانگے والے سے کہا کہ ذرا آگے چلیے۔ وہ آگے چل دیا، راستے میں رُک رُک کر ہم ''نیولیڈر کو'' کا پوچھتے رہے لیکن کسی نے ہمیں نہ بتایا۔ پھر تانگے والے سے کہا کہ اب واپس اسی جگہ چلو جہاں سے ہم بلی ماراں میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے تانگہ واپس کیا تو تھوڑی دور کے بعد تانگے والے نے تنگ آ کر کہا کہ آپ کو جہاں جانا ہے اس کا آپ کو پتہ نہیں۔ میرا تانگہ خالی کرو کسی سرائے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چلے جاؤ۔ میرا تانگہ کوئی آپ نے مول لے لیا ہے کہ چھوڑتے نہیں ہو۔ والدہ صاحبہ یہ سن کر رونے لگ گئیں۔ چھوٹے بھائی مجھے دیکھتے اور میں پریشان ہونے کے باوجود والدہ صاحبہ کو تسلی دیتا، بالآخر میری تانگے والے سے لڑائی ہوگئی۔ وہ کہتا تانگہ خالی کرو، میں کہتا کہ ہم اس وقت تک تانگہ خالی نہیں کریں گے جب تک ہمیں والد صاحب کا پتہ نہیں ملتا۔ تانگہ تو ایک جگہ پر رُکا ہوا تھا اور ہماری لڑائی کی وجہ سے لوگ تانگے کے ارد گرد جمع ہوگئے اسی مجمع میں ایک نوجوان نے مجھ سے پوچھا کہ بھائی کیا معاملہ ہے یہ لڑائی کیسی ہے؟ تانگے والے نے فوراً جواب دیا کہ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ انہوں نے کہاں جانا ہے اور میرا تانگہ بھی نہیں چھوڑتے۔ میں نے کہا کہ ہم اس وقت تک تانگہ نہیں چھوڑیں گے جب تک ہمیں اپنے والد صاحب کا پتہ نہیں ملتا۔ لڑائی کا سبب پوچھنے والے نے مجھے کہا کہ بھائی آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہم پنجاب سے آئے ہیں۔ اس نے جواباً کہا کہ بھائی میرے پنجاب تو بہت بڑا صوبہ ہے۔ آپ کون سے شہر سے آئے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ ہم چنیوٹ سے آئے ہیں۔ بس چنیوٹ کا نام سنتے ہی اس نے کہا کہ مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ تانگے والے ان کا سامان یہیں سامنے والی دکان جو کہ بند تھی کے تھڑے پر اُتار دو۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا اسی دکان کے پہلو سے جو سیڑھیاں اوپر کو جاری ہیں یہاں پر چنیوٹ کے ہی رہنے والے رہائش پذیر ہیں۔ والدہ اور بھائیوں کو ساتھ لے کر اوپر چلے جاؤ، یہاں سے آپ کو اپنے والد کا پتہ ضرور مل جائے گا۔ میں نے بھی سکھ کا سانس لیا اور تانگہ چھوڑ کر سامان دکان کے تھڑے پہ رکھ کر والدہ کے ساتھ اوپر چلے گئے۔ اوپر بوڑھی عورت نے چنیوٹی زبان میں میری روتی ہوئی والدہ کو تسلی دی اور کہا کیوں پریشان ہوتی ہو یہاں سے چنیوٹ تو تھوڑی دور ہے ہم تو تمہاری عمر میں اکیلے ہی چنیوٹ سے کلکتہ چلے جاتے تھے۔ ابھی میرا بیٹا آتا ہی ہوگا، اس سے بچوں کے والد صاحب کا پتہ چل جائے گا۔ اس عورت نے جلدی جلدی روٹیاں پکا کر ہمیں کھلایا پلایا اور اتنے میں ان کے بیٹے شیخ اسلم دہرہ آگئے۔ انہوں نے ملتے ہی کہا کہ تم لوگوں نے تو کل آنا تھا آج آگئے ہو، مجیدی صاحب (میرے والد) یہاں سامنے ہی تو رہتے ہیں۔ وہ آج نیو دہلی جانے سے پہلے کہہ رہے تھے کہ کل میرے بچے آرہے ہیں۔ ہمیں تسلی ہوئی۔ چھوٹے بھائی سامان کے ساتھ نیچے بیٹھے تھے، سامان اوپر اٹھا لیا گیا اور ہم مطمئن ہو کر ان کے گھر والد صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں نصیر یا صغیر دونوں بھائیوں میں سے ایک نے نیچے اُتر کر چاندنی چوک بازار میں سیر کرنی شروع کی تو انہیں ایک جگہ سامنے سے والد صاحب آتے نظر آگئے وہ ان کے ساتھ لپٹ گئے اور کہا کہ ''ابّا جی ہم آگئے'' انہوں نے حیران ہو کر کہا کہ تم لوگوں نے تو کل آنا تھا آج کیسے آگئے۔ بہر حال والد صاحب ہمیں مل گئے اور ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا، دراصل لاہور سے جو ٹیلی گرام ہم نے والد صاحب کو بھیجی تھی وہ انہیں موصول نہ ہوئی اور اسی وجہ سے ہمیں یہ پریشانی اٹھانا پڑی۔ والد صاحب ہمیں جہاں ہم رُکے ہوئے تھے بالکل اس کے سامنے ایک عمارت میں لے آئے۔ یہ عمارت چاندنی چوک سے بلی ماراں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر تھی۔ مڑتے ہی بائیں ہاتھ ایک پانی کی پختہ سبیل تھی اور اس کے ساتھ سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں اوپر جا کر ایک جگہ بہت بڑا کمرہ تھا، جہاں سے پھر آگے حبیب بینک کی ایک شاخ تھی جس کے ساتھ سیڑھیاں چڑتے ہی ہماری رہائش کے لیے دو کمرے تھے جہاں ہم مقیم ہوگئے۔ ہمارے گھر کے بالکل سامنے ایک مسجد تھی اور یہ جگہ چاندنی چوک اور بلی ماراں کے سنگم پر تھی جہاں سے بلی ماراں کا محلّہ شروع ہوتا ہے۔

جاری ہے

© rasailojaraid.com